فریضۂ اقامت دین

خُرّم مُرادؔ

منشُورات

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : فریضہء اقامتِ دین

مصنف : خرم مراد

طبع اول : نومبر ۲۰۰۸ء

تعداد : ۲۰۰۰

کوڈ : 00129

ناشر : منشورات

E-8، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ 54790

042-35252210 - 35252211

042-35252194

SMS ur Address:
0332-003 4909, 0320-543 4909

manshurat@gmail.com / @hotmail.com

www.facebook/manshurat

www.pinterest.com/manshurat

مطبع : قومی پریس، ۵۰ لوئر مال، لاہور۔

قیمت : ۸ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے عزیز بچو! آپ میں سے کچھ علم میں زیادہ ہیں اور کچھ کم۔ اسی طرح کوئی عمر میں بڑے ہیں اور کوئی چھوٹے۔ چنانچہ میں سب کا لحاظ کر کے بہت سادہ الفاظ میں اقامتِ دین کے فریضے پر چند باتیں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ سادہ بات کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ جتنی کم پڑھے لکھے کے لیے قابلِ فہم ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ پڑھے لکھے کے لیے بھی موثر ہو سکتی ہے۔ انبیاے کرام کی دعوت کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ دین کی دعوت کو اس زبان میں پیش کرتے ہیں جس کو ہر سطح کا آدمی سمجھ بھی سکے اور قبول بھی کر سکے۔

دین کے کیا معنی ہیں؟

اگر ہم لغت اور عام معنوں کے لحاظ سے دیکھیں تو دین کے بہت سارے معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ معنی جن میں یہ عام طور پر ہمارے درمیان بولا اور سمجھا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم زندگی کیسے بسر کریں؟ اس بارے میں ہمارے پیدا کرنے والے نے ہمیں جو راستہ بتایا ہے، اور جو ہدایت دی ہے وہ دراصل دین ہے۔

ہم دُنیا میں اپنی مرضی سے تو نہیں آئے لیکن بہرحال یہاں موجود ہیں، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہاں اس زمین پر ہماری موجودگی کا وقت ایک محدود اور مقررہ وقت ہے جو ختم ہونے والا ہے۔ زندگی میں بہت ساری چیزیں ہیں جو ہمیں بغیر کسی محنت اور بغیر کسی کوشش کے خود بخود مل گئی ہیں۔ ہمارا جسم ہے۔ ہماری آنکھیں ہیں جن سے ہم آسمانوں تک دیکھ سکتے ہیں۔

ہمارے کان ہیں جن سے ہم ہر قسم کی بات سن سکتے ہیں۔ ہماری زبان ہے جس سے ہم وہ باتیں کہہ سکتے ہیں جن سے انسان کی زندگی میں امن وسکون پیدا ہو، اور وہ باتیں بھی کہہ سکتے ہیں جن سے خرابی اور بگاڑ پیدا ہو۔ یہ الفاظ ہیں جن سے بڑے بڑے انسان اور بڑے بڑے گروہ حرکت میں لائے جا سکتے ہیں۔ یہ الفاظ ہی ہیں جو بڑی بڑی قوموں کو افیم کی نیند سلا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے پاس عقل اور ہاتھ پاؤں ہیں جن کی مدد سے ہم سمندر کی سطح پر تیر سکتے ہیں، ہواؤں میں سفر کر سکتے ہیں، زمین کا سینہ چیر کے اس کے چھپے خزانے نکال سکتے ہیں، اور چاند ستاروں تک بھی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز ہماری اپنی بنائی ہوئی نہیں ہے، اور نہ کوئی چیز ہم نے اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کی ہے۔ جس طرح کوئی آدمی ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے کہہ سکتا ہے کہ اس نے روپیہ پیسہ، اینٹ پتھر اور محنت سے یہ مکان بنایا ہے، اس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز ہماری بنائی ہوئی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیدائش اور موت کے درمیان زندگی کی جو مہلت ہمیں ملی ہوئی ہے، اور یہ بہت ساری چیزیں جو ہماری دسترس میں ہیں، ہم کو ان پر اختیار حاصل ہے کہ ہم ان کو جس طرح چاہیں استعمال کریں...... اس وقت اور اس مہلت عمل کو ہم کس طرح استعمال کریں؟ وہ چیزیں جو ہم کو اس طرح مل گئی ہیں، خواہ وہ ہمارے اپنے اندر ہوں، جیسے عقل، دل اور جسم و جاں کی قوتیں، یا جو ہمارے وجود سے باہر ہوں، جیسے پیداوار، کھیتیاں اور کارخانے، یا دوسرے انسان جن سے ہمارا تعلق قائم ہوتا ہے، یہ سب کچھ جس کا نام انسانی زندگی ہے...... اس کو ہم کیسے بسر کریں؟

اس سوال کا جواب انسان نے ہمیشہ تلاش کیا ہے۔ اس نے کبھی اپنی عقل سے، کبھی اپنے اٹکل پچو سے، کبھی سائنس کے تجربات سے، کبھی تاریخ کی داستانوں سے، کبھی ماں باپ کی سکھائی ہوئی باتوں سے، اور کبھی معاشرے میں رائج رسم و رواج سے زندگی بسر کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اختیار کیا ہے۔

انھی طریقوں میں سے ایک طریقہ وہ ہے کہ جو ہمارے جیسے انسانوں نے یہ کہہ کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ یہ طریقہ نہ انسان کی عقل کی ایجاد ہے، نہ کسی کے تجربے کی پیداوار ہے، بلکہ یہ تمھارے پیدا کرنے والے نے تم کو بتایا ہے کہ تم زندگی اس طرح بسر کرو۔ اس بات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو طریقہ انھوں نے بتایا ہے وہ عقل یا ہماری فطرت کے خلاف ہے، یا تاریخ اور سائنس کے تجربات کے خلاف ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ انھوں نے تو اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ وہ بتا رہے ہیں، یہ وہ طریقہ ہے کہ جو ہماری عقل، ہماری فطرت، ہمارے علم، ہماری تاریخ اور ہر چیز سے مطابقت رکھتا ہے۔

انھوں نے یہ نہیں کہا کہ آنکھیں بند کرلو، سوچنا چھوڑ دو، کانوں میں انگلیاں ڈال لو اور اس کے بعد اس دین کو مانو۔ ایسا نہیں ہے بلکہ انھوں نے کہا کہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو، اور اپنی عقل سے سوچو۔ دُنیا کے اوپر غور وفکر کرو۔ آسمان و زمین کے نظام کے بارے میں سوچو۔ رات اور دن کے آنے جانے پر غور کرو۔ آسمان سے برستی ہوئی بارش کو دیکھو۔ زمین سے اُگتی ہوئی کھیتی کو دیکھو۔ اس کے نتیجے میں تم اس حقیقت کو پالو گے، اور تمھاری عقل، تمھاری فطرت، کائنات کا ایک ایک ذرہ، سورج، چاند اور ستارے، پہاڑ اور درخت، بارش اور پیداوار اور کھیتی، ہر چیز اس بات کی تائید کرتی ہے کہ دراصل زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ وہی ہے جو ہم تمھارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ہم سے مراد رسول اور انبیا ہیں۔ انبیا کے مطابق یہ وہ طریقہ ہے جو تمھارے پیدا کرنے والے نے تم تک پہنچایا ہے۔

یہ ہے دراصل دین کی بنیاد۔ یہ ہیں دین کے معنی، یعنی زندگی بسر کرنے کا طریقہ۔

اس طریقے کے اندر دو باتیں ایسی ہیں جو بڑی اہم ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ زندگی بسر کرنے کا یہ طریقہ پوری زندگی کے لیے ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ زندگی کا ایک حصہ تو اس دین کے اندر رہ کر گزارا جائے، اور کوئی دوسرا حصہ اس سے باہر گزارا جائے۔ اگر ہماری عقل اور ہماری فطرت اس بات پر مطمئن ہوجائے کہ یہ وہی طریقہ ہے

جو ہمارے پیدا کرنے والے نے ہم کو دیا ہے، تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری پوری زندگی اسی طریقے کے مطابق بسر ہونا چاہیے، اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اس کے دائرے سے باہر ہو۔ گھر کی زندگی ہو یا گھر سے باہر کی، دل کی زندگی ہو یا جسم کی، خاندان ہو یا بازار، حکومت ہو یا سیاست، قانون ہو یا معاشرتی تعلقات......ایک انچ زمین بھی انسانی زندگی کی ایسی نہیں ہے جو اس دین سے باہر ہو۔ اس لیے کہ اس دین کی روح اور دین کی بنیاد یہ ہے کہ ہم پورے کے پورے اپنے پیدا کرنے والے کے غلام اور اس کے بندے ہیں۔

ہم کیا کریں گے اور کیا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کا بخشا ہوا ہے، اور نہ صرف یہ کہ وہ پیدا کرنے والا ہے بلکہ آقا، مالک اور حاکم بھی ہے۔ اگر وہ آقا اور مالک ہے تو پوری زندگی کی زمین پر اسی کی حکومت چلنی چاہیے۔ جس طرح وہ دل کی گہرائیوں میں حکمراں ہوگا، اسی طرح حکومت کے ایوانوں میں بھی حکمراں ہوگا۔ جس طرح ماں باپ اور بچوں کی زندگی میں اس کی حکومت چلتی ہے، اسی طرح بازار اور تعلیمی اداروں اور تجارتی اداروں میں بھی اسی کی حکومت چلنی چاہیے۔ یہ بالکل اسی طرح صاف اور واضح بات ہے کہ اگر پاکستان کی پوری سرزمین پر کوئی حکومت حاکم ہونے کی مدعی اور حق دار ہو، تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی حکومت پنجاب میں تو چلے لیکن سندھ میں نہ چلے درحقیقت اس سرزمین کا کونا کونا اسی کی حکومت کے تحت ہوگا۔

اگر ہم زندگی کو اس زمین کی طرح دیکھیں تو اس زمین کا ایک انچ بھی ایسا نہیں ہے جو کسی دوسرے کے ماتحت ہو، اور اگر وہ کسی دوسرے کے ماتحت ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی دوسرا خدا بھی ہے۔ جس کسی کا بھی حکم ہماری زندگی پر اس طرح چلتا ہو کہ وہ اللہ کے حکم سے الگ ہو کر چلے تو وہ خود اپنی جگہ ایک خدا بن جاتا ہے۔ چنانچہ دین کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے۔ الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز جس کے ہم اتنے وفادار ہوں، اتنے تابعدار ہوں، اتنی محنت کرنے والے ہوں کہ اللہ کے علاوہ یا اللہ کے زیادہ ان سے وفاداری یا محبت ہو یا ان کی

اطاعت کی جائے۔ یہ بت اور اِلٰہ پتھر کے بھی ہو سکتے ہیں، چاند اور ستارے بھی ہو سکتے ہیں، درخت بھی ہو سکتے ہیں، اور ہم خود بھی اپنا خدا بن سکتے ہیں۔ ہمارا اپنا نفس بھی اگر ایسا ہو جائے کہ ہم اس کی پیروی اس طرح کریں کہ اللہ کو نظر انداز کر دیں، تو وہ بھی ایک خدا ہے۔ قرآن نے کہا ہے:

اَرَءَ یۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (الفرقان ۲۵ :۴۳)

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنالیا ہو؟

ایک دفعہ قرآن کی ایک آیت یہودیوں اور نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی تو قرآن نے کہا:

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَ هُمۡ وَرُهۡبَا نَهُمۡ اَرۡبَاباً مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (التوبه ۹ : ۳۱)

انھوں نے اپنے علما کو اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔

حاتم طائی کا نام آپ نے سُنا ہوگا، بہت مشہور نام ہے۔ حاتم طائی ایک عیسائی تھے۔ ان کے بیٹے عدی بن حاتم تھے۔ وہ مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ قرآن کی یہ آیت کس کے لیے ہے؟ انھوں نے کہا ہم نہ تو اپنے علما کی پرستش کرتے ہیں، نہ ان کے آگے نماز پڑھتے ہیں، اور نہ ان کے آگے سجدہ ہی کرتے ہیں، تو پھر قرآن نے یہ کیسے کہہ دیا کہ ہم نے اپنے علما اور اپنے پیروں کو رب بنالیا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ تمھارے علما اور پیر جس بات کو کہیں کہ یہ جائز اور حلال ہے، تم اس کو آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہو کہ یہ حلال اور جائز ہے۔ اسی طرح جس بات کو وہ کہیں کہ یہ حرام اور ناجائز ہے، تو آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہو کہ یہ حرام اور ناجائز ہے۔ اس پر حاتم طائی کے بیٹے عدی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں، حضور ﷺ یہ بات تو ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بس یہی تو رب بنانا ہے۔

گویا الٰہ صرف وہی نہیں ہوتا جس کے آگے آدمی سجدہ کرے، بلکہ اللہ کے حکم دین اور شریعت سے ہٹتے ہوئے آدمی جس کا قانون مانے، جس کے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کو تسلیم کرے، وہ بھی اِلہ ہے۔ لہٰذا اس دل پر اور اس زندگی پر ایک ہی اِلہ کی حکمرانی ہوسکتی ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ۔ یہ دراصل دین کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری زندگی بہت سی چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھیے تو بہت ساری خواہشات دل کے اندر جنم لیتی ہیں۔ محبت بھی ہوتی ہے اور نفرت بھی، پسند اور ناپسند بھی ہوتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے، تعلق بھی ہوتا ہے اور دشمنی بھی، مال کی محبت بھی ہوتی ہے اور اچھے مکان کو بھی دل چاہتا ہے۔ کبھی اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور کبھی اپنے کو بڑا کرنے کا جذبہ سر اٹھاتا ہے، کبھی کسی سے حسد ہو جاتا ہے اور کبھی کوئی برا لگنے لگتا ہے۔ غرض بہت ساری خواہشات ہیں، جو دل کے اندر موجود ہوتی ہیں۔

اسی طرح دل سے باہر بھی ایک زندگی ہے۔ جس گھر میں ہم آنکھ کھولتے ہیں وہاں پہلے سے کم سے کم دو انسان تو ہوتے ہی ہیں، جن میں ایک کو ہم باپ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ایک کو ماں کی حیثیت سے۔ پھر اور بھی انسان ہو سکتے ہیں، جیسے پہلے یا بعد میں ہونے والے بہن بھائی، چچا اور ماموں وغیرہ۔ گھر سے باہر تو ایک دُنیا آباد ہے۔ بہت سارے لوگ ہیں، دکاندار ہیں، محلے والے ہیں۔ اسی طرح باپ کے دوست ہیں، سکول جاتے ہیں تو وہاں ہمارے اپنے دوست بن جاتے ہیں۔ گویا اگر دیکھا جائے تو ہماری زندگی کا ایک بڑا حصہ دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کا تعلق نہ ہو تو ہم پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ ہماری پیدایش بھی دو انسانوں کے ملنے سے ہوتی ہے۔ اگر یہ دو انسان، یعنی ہمارے والدین خبرگیری نہ کریں تو جانور کا بچہ تو اپنے والدین کی پرورش کے بغیر جی سکتا ہے لیکن انسان کا بچہ بھوکا مر جائے گا، جی نہیں سکتا۔

ہماری زندگی دو انسانوں کی محنت، ان کی شفقت اور ان کی محبت کی وجہ سے ممکن ہے جن کو

ہم ماں باپ کہتے ہیں۔اس کے بعد جہاں بھی زندگی ہوگی، دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق کے اندر بندھی ہوئی ہے۔ہم اکیلے یا تنِ تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتے۔اگر ہم کسی پہاڑ کی کھو میں بھی جا کر بیٹھ جائیں، یا کہیں خانقاہ میں جا کر بیٹھ جائیں تو بھی ہمیں کھانے کی ضرورت پڑے گی، اور کھانا وہی آئے گا جو کسی کسان نے زمین پر اگایا ہوگا، اور کسی انسان نے اسے پکایا ہوگا۔ کپڑے کی ضرورت پڑے گی تو کپڑا بھی اس روئی سے بنے گا جو کسی انسان نے اگائی ہوگی اور کسی دوسرے انسان نے اسے بن کر کپڑا بنایا ہوگا۔لہٰذا انسانی زندگی کا کوئی تصور اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کے تعلق سے بندھی ہوئی ہو۔ یہ سارے تعلق بھی اللہ کی اطاعت کے تحت آنے چاہییں۔

اب اگر دین کے مطابق زندگی بسر کرنا ہو تو اس کے دو معنی ہیں۔ایک معنی ہیں مسلمان ہونا، اور دوسرے معنی ہیں مسلمان بننا۔

مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جیسے ہی ہم نے اس بات کو مان لیا کہ ہمارا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، ہم اسی کے سامنے جواب دہ ہیں اور صرف اسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ ہم اس کی اطاعت کریں اور اس نے نبی اور رسول کے ذریعے زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ دیا ہے اس پر چلنا ہمارا فرض ہے......جیسے ہی ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا تو ہم مسلمان ہو گئے۔ لیکن مسلمان بننے کا جو عمل ہے وہ اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے کہ اگر ہم کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تو ہم مسلمان ہو گئے، یا اگر کلمہ پڑھ لیا تو مسلمان ہو گئے، لیکن مسلمان بننے کے معنی یہ ہیں کہ ہماری پوری زندگی اس دین کے مطابق ہو جائے جو اللہ نے ہمیں دیا ہے۔لہٰذا مسلمان ہونے اور مسلمان بننے کے درمیان فرق ہے۔

مسلمان ہونے سے دین کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا، اس کے لیے مسلمان بننا بھی ضروری ہے۔ جیسے ہی ہم مسلمان بننے کی کوشش کریں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دوسرے انسانوں

کے ساتھ جو بہت سے تعلقات قائم ہیں، جیسے گھر اور خاندان میں ماں باپ اور بہن بھائی اور رشتہ داروں سے، محلے میں پڑوسیوں سے، کاروبار میں کاروبار کرنے والوں سے، ملازمت میں افسروں، ماتحتوں اور ساتھیوں سے، تعلیم گاہ میں استادوں اور شاگردوں سے، حکومت میں رعایا اور حکومت کے درمیان تعلق، غرض جہاں جو بھی تعلق ہے یہ تعلق اللہ کے دین کے مطابق ہونا چاہیے، تب جا کر ہم مسلمان بنیں گے۔ جتنا یہ تعلق دین کے مطابق ہو، یا کم سے کم ہم اسے دین کے مطابق بنانے کی کوشش کریں، اتنا ہی اللہ کے دین کے مطابق ہماری زندگی ہوگی۔ گویا مسلمان کے معنی ہیں کہ جو اپنی پوری زندگی کو اللہ کے دین کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اور یہ ایسا فرض ہے کہ جو مسلمان ہونے کے فوراً بعد عائد ہو جاتا ہے۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک آدمی فوج کی نوکری کے لیے درخواست دیتا ہے۔ جب وہ درخواست منظور ہو جاتی ہے تو اس کو فوج میں بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ بھرتی ہونے پر اس کو ایک تقرری کا خط اور ایک وردی مل جاتی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ فوج میں داخل ہو گیا۔ لیکن فوج میں داخل ہونے کے بعد اب اس کو اپنی پوری زندگی فوج کے ضابطوں اور تربیت کے مطابق بنانا ہے۔ اس کا یہ کام چلتا رہے گا جب تک کہ وہ فوج کے اندر رہے گا۔ اسی طرح مسلمان ہونا یا اسلام کے اندر داخل ہونا، اور ایک مسلمان بننا ہے، اور مسلمان بننے کا یہ عمل عمر بھر کا کام ہے۔

مسلمان بننے کا کام مختلف حوالوں سے آدمی اکیلا نہیں کر سکتا بلکہ اسے بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ مختلف حوالوں سے تعلق رکھنا ہوتا ہے۔ اگر بیٹا ہے تو اس کا ماں باپ سے تعلق ہوگا، اگر شہری ہے تو حکومت سے تعلق ہوگا، اگر ملازم یا تاجر ہے تو معیشت سے تعلق ہوگا، اگر جج یا مدعی ہے تو قانون سے تعلق ہوگا۔ گویا زندگی کے جس گوشے میں بھی وہ مسلمان بننا چاہے گا، اس کا دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق قائم ہوگا۔ اس لیے وہ مسلمان بننا چاہے گا تو اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ زندگی میں ہر جگہ اللہ کے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے۔

دوسرے الفاظ میں اس بات کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرے۔

اللہ کے دین کو قائم کرنے کے معنی دراصل یہ ہیں کہ پوری زندگی کو اللہ کے دین کے ماتحت لانا، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے دین کو زندگی میں ہر جگہ کھڑا کر دینا۔ اقامت کے معنی ہوتے ہیں کھڑا کر دینا، اور عربی میں اقامہ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اس کی صحیح شکل وصورت میں کھڑا کر دینا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح نماز پڑھنا فرض ہے، روزہ رکھنا فرض ہے، زکوٰۃ دینا فرض ہے اور حج کرنا فرض ہے، اسی طرح اللہ کے دوسرے احکام بھی فرض ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ **وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (الشوریٰ ۴۲:۳۸)، یعنی مسلمانوں کے معاملات مشورے سے طے ہونا چاہیں، یہ بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح **يُقِيْمُوْن الصلوٰة** ، یعنی وہ نماز کو قائم کرتے ہیں۔ اگر قرآن مجید نے یہ فرمایا کہ **فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا** (المائدہ ۵:۳۸) یعنی چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورتوں کے ہاتھ کاٹ دوٗ تو یہ بھی اسی طریقے سے فرض ہے جس طرح یہ فرض ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

گویا ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید یہ نہیں کہتا ہے کہ نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ کا دینا ایک درجے کا فرض ہے، جب کہ مشورہ کرنا اور چور کا ہاتھ کاٹنا اور قانون نافذ کرنا اور وراثت کا قانون نافذ کرنا، یہ دوسری طرح کے احکام ہیں۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم ان احکام کو مانو یا نہ مانو، نیز اس کے باوجود بھی تم مسلمان ہو سکتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کی کوئی آیت نہیں ہے جو یہ کہتی ہو کہ یہ دونوں مختلف قسم کے حکم ہیں، بلکہ وہ کہتا ہے کہ ساری کتاب ایک ہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن اس بات پر تنقید کرتا ہے: **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (البقرہ ۲: ۸۵)' یعنی تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لا کر اس پر عمل کرتے اور بعض حصے پر عمل نہ کر کے اس کا انکار کرتے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ یہ تو بڑی بری روش ہے اور جو ایسا کرے گا وہ دُنیا میں ذلیل ورسوا ہو کر رہے گا۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر ماننا ہے تو اسے پورے کا پورا مانو۔ **اِدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً** (البقرۃ ۲:۲۰۸) 'اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اگر قرآن نے یہ نہ بھی لکھا ہوتا کہ دین کو قائم کرو، اگر ہم غور کرتے تو ہم خود یہ محسوس کرتے کہ اگر دین پوری زندگی کے لیے ہے، اگر ہم پوری زندگی میں اللہ کے بندے ہیں، اگر قرآن کا ہر حکم یکساں طور پر واجب الاطاعت ہے، اگر خدا کا ہر کہنا ماننا ضروری ہے، تو ہمارا یہ فرض بن جاتا ہے کہ جس طرح ہم نماز پڑھنے کے لیے جہاں بھی ہوتے ہیں مسجد بناتے ہیں، پانچ وقت کی نماز کا اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح مسلمان جہاں بھی بسیں، ان کو اسلام کے سارے احکام خواہ وہ سود کے بارے میں ہوں یا شراب کے بارے میں، رشوت کے بارے میں ہوں یا ظلم و ناانصافی کے بارے میں، وراثت کے بارے میں ہوں یا زنا کے بارے میں، چور کے بارے میں ہوں یا عدل و انصاف کے بارے میں، یہ سارے قوانین بھی نافذ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جس طرح کہ محلے میں مسجد بنا کے پانچ وقت کی نماز کا اہتمام کرنا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری زندگی کا مطالبہ کیا ہے۔ اسی لیے فرمایا: **اِدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً** (البقرہ ۲:۲۰۸) 'یعنی دین پورے کا پورا اختیار کرو۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کا کوئی حکم زیادہ واجب التعمیل ہے اور کوئی حکم کم واجب التعمیل یا کوئی حکم زیادہ اہم ہے اور کوئی کم اہم۔ قرآن نے اپنے احکامات کے بارے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اس لیے جو آدمی پوری زندگی میں اللہ کا بندہ بن کر جینا چاہے گا وہ لازماً اس بات کی کوشش کرے گا کہ وہ اللہ کے دین کو قائم کرے اور پوری زندگی میں قائم کرے۔

قرآن مجید نے تو کھل کر اس بات کا مطالبہ بھی کیا ہے کہ دین کو قائم کیا جائے۔

گویا جو دین ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دیا، نوح علیہ السلام کو دیا، اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیا اور تم کو دیا، ہم نے سب کو یہ حکم دیا کہ دین کو قائم کرو۔ اس لحاظ سے اگر ہم عقل سے سوچیں یا فطرت پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین کا قائم کرنا ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے۔

انبیاے کرام کی زندگی کو دیکھیے۔ اس لیے کہ اگر دین کو سمجھنا ہے تو اس کے لیے ضروری

ہے کہ جولوگ دین لے کر آئے، ہم یہ دیکھیں کہ انھوں نے دین کو کیسے سمجھا۔ کیا وہ انبیا جو دین کو لے کر آئے، انھوں نے لوگوں سے صرف یہ کہا کہ نماز پڑھ لو، روزہ رکھ لو، زکوٰۃ دو اور حج کرلو اور یہ کافی ہے، یا انھوں نے یہ کیا کہ کسی گوشے میں جا کر بیٹھ گئے، نیک آدمی بن گئے اور لوگوں کو نیکی کا وعظ کیا اور اس کے بعد انھوں نے سمجھا کہ دین کا تقاضا پورا ہوگیا۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے لے کر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیا نے اس بات کی کوشش کی کہ اللہ نے جو بھی دین دیا ہے وہ پورے کا پورا قائم کریں۔

ہمارے لیے تو اصل روشنی اور اصل راستہ وہ ہے جو ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد بھی کیا، تلوار بھی اٹھائی، قانون بھی نافذ کیا، نکاح وطلاق کے قوانین بھی جاری کیے، حدود بھی نافذ کیں، زانیوں کو سزا بھی دی، چوروں کے ہاتھ بھی کاٹے، مقدمات کے فیصلے بھی کیے، حکومت بھی کی اور تجارت بھی کی۔ یہ اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ قرآن مجید نے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الآحزاب ۳۳: ۲۱)

تمھارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی بہترین نمونہ ہے۔

لہٰذا اگر اللہ کے رسول کی ہم پیروی کریں اور اس بات کو سمجھنا چاہیں کہ دین کیا ہے، تو یہ بات واضح ہے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنا ہمارا فرض ہے۔

یہ ہمیشہ سے ہے کہ بڑے بڑے کام انجام دینا مشکل ہوتا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ مشکل کام کرنے سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی گوشے میں بیٹھ کر نماز پڑھ لینا یا مسجد بنا لینا، یہ آسان کام ہے۔ نفل پڑھ لینا، درود پڑھ لینا، یا ختم کرا لینا، یہ نہایت آسان کام ہے۔ میلاد کرنا، ختم قرآن کرانا، سیرت کا جلسہ کرانا، تقریر کرنا، درس دینا، یہ سب بھی بڑے آسان کام ہیں۔ لیکن اللہ کے دین کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جب ہزاروں انسانوں سے ہمارا تعلق ہے، اس میں حکمراں بھی ہیں اور تاجر بھی، جج بھی ہیں اور وکیل بھی، پڑوسی بھی ہیں اور ماں باپ بھی،

دوست احباب بھی ہیں اور رشتہ دار بھی، اگر ہم کہیں کہ سارے تعلقات اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں تو جو لوگ اس بات کو نہیں مانتے، ان سے کشمکش ہوگی۔ اس کے لیے محنت کرنا پڑے گی۔

کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر بیج ڈال دیا جائے تو خود بخود اُگ آتا ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ زمین کے اوپر ہل چلائیں، بیج ڈالیں، پانی دیں اور دن رات اس پر محنت کریں، تب جا کر فصل حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی زمین کے بارے میں آدمی کو یہ یقین دلایا جائے کہ تم بیج ڈال دو تو کھیتی اُگ آئے گی، پھر اس آدمی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنا خون پسینہ ایک کرے، ہل چلائے اور محنت کرے اور پھر اس کے بعد فصل حاصل کرے۔ بدقسمتی سے لوگوں نے مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ بس بیج ڈالنے سے ہی بغیر کسی محنت کے ثواب کی کھیتی اُگ آئے گی۔ نماز پڑھ لو اور چھوٹے چھوٹے کام کر لو، بس یہی فرض ہے اور کچھ فرض نہیں ہے۔

قرآن مجید نے تو اس بات کو کھول کر بیان کیا ہے کہ پوری زندگی میں اطاعت کرنا ضروری ہے، اور اس کے لیے محنت اور جدوجہد ناگزیر ہے۔ درحقیقت اُمت مسلمہ بنی ہی اسی لیے ہے کہ وہ اللہ کے دین پر خود بھی چلے اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے کوشش بھی کرے، اور اللہ کے دین کو قائم کر کے لوگوں کو دکھا دے کہ اللہ کا دین کیسا ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مطالبہ کیا ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج ۲۲ : ۷۸)

اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

آگے چل کر مزید فرمایا کہ جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کے دین کو قائم کر کے تمھارے سامنے گواہی قائم کی ہے، اسی طریقے سے تم بھی لوگوں کے سامنے اللہ کا دین قائم کر کے گواہی دو۔

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۲: ۱۴۳)

تاکہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

جہاد کے معنی بھی دراصل انتہائی کوشش کرنے کے ہیں۔ کوشش اسی لیے فرض ہے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنا فرض ہے۔ یہ وہ سبق ہے جو مسلمان بھول چکے ہیں اور یہ وہ سبق ہے جو ان کو یاد کرانا ضروری ہے۔ انسانی جسم کی زندگی کا انحصار آنکھ، کان یا ہاتھ پاؤں پر نہیں ہوتا بلکہ اس کی روح کے اوپر ہوتا ہے۔ اگر جسم سے روح نکل جائے تو بظاہر جسم ویسے کا ویسے ہی رہتا ہے۔ اگر کسی لاش کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی واضح فرق نہیں ہوتا۔ اس کے آنکھ، کان، پاؤں اور پورا جسم ویسا ہی رہتا ہے جیسے زندہ انسان کا ہے، لیکن وہ انسان نہیں بلکہ ایک لاش ہوتی ہے۔ اسی طریقے سے قوموں کے لیے مقصدِ زندگی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب روح نکل جائے تو بظاہر سارے مراسم عبودیت، درسِ قرآن اور حج کے مناسک اور زکوٰۃ اور مساجد اور سر اور داڑھیاں اور لباس، سب ایک جسم اور وجود کی طرح موجود ہوتے ہیں، لیکن روح نکل جاتی ہے۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے یہ اُمت بنائی ہی اس لیے تھی کہ یہ اللہ کے دین کو قائم کرے، اللہ کے دین پر گواہ بنے، اللہ کے کلمے کو اونچا کرے، اور جب یہ مقصد نکل گیا تو گویا روح ہی نکل گئی۔ جب روح نکل جائے تو جسم کے اندر کوئی قوت نہیں رہتی۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طرف تو کوئی زندہ شیر کھڑا ہوا ہو، اور دوسری طرف شیر کی کھال میں بھُس بھر کے ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔ بظاہر تو وہ ایک طرح کے شیر نظر آئیں گے لیکن ایک شیر نقلی ہے کہ اس کے اندر بھُس بھرا ہوا ہے، جب کہ دوسرا شیر اصلی ہے کہ اس کے اندر جان ہے، خون گردش کر رہا ہے، قوت ہے۔ نقلی شیر کو بچہ بھی دھکا دے گا تو وہ گر جائے گا لیکن اصلی شیر کا مقابلہ کرنے کے لیے قوت چاہیے۔

جب مسلمانوں کے جسم سے روح نکل گئی تو منگول آئے، تاتار آئے، انگریز آئے اور یورپین اقوام آئیں، اور امریکہ اور روس کے لوگ آئے، اور مسلمان نقلی شیر کی طرح ان کے سامنے گرتے چلے گئے۔ بظاہر مسجدیں بھی تھیں، علما بھی تھے، نمازیں بھی ادا کی جاتی تھیں، روزے بھی رکھے جاتے ہیں، ایک طرح سے پورے دین کی شکل موجود تھی۔ لیکن نقلی شیر کی

طرح اس میں روح نہیں تھی، اس میں جان نہیں تھی۔ اقامت دین کے مقصد کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ اس لیے دُنیا کی قومیں ان کو مسخر کر کے ان کو پچھاڑتی چلی گئیں۔ آج بھی مسلمان ذلت اور پستی سے، اسی وجہ سے دوچار ہیں۔ اگر یہ اقامت دین کا فرض پہچان جائیں، اس کے لیے کھڑے ہو جائیں، اس کے لیے جمع ہو جائیں تو اس جسم کے اندر روح بیدار ہو جائے گی، اور ان کی نمازوں، روزوں، حج اور مساجد میں زندگی کی ایک نئی رمق پیدا ہو جائے گی۔

یہ اصل فرض ہے جس کے لیے مسلمان برپا ہوئے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جب اسلام آیا تو اس وقت نمازیں پڑھنے والے عیسائی بھی موجود تھے، بلکہ ایسے عیسائی تھے جو رات رات بھر اللہ کی بندگی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ راتوں کو رونے اور سجدہ کرنے والے یہودی تھے جو اللہ کو ایک مانتے تھے۔ ان کے پاس اللہ کی کتاب بھی تھی اور شرک نہیں کرتے تھے۔ لیکن قرآن مجید نے آکر ایک نئی اُمت اس لیے پیدا کی کہ وہ اللہ کے دین کو قائم کرے۔ لہٰذا اللہ کے دین کو قائم کرنا ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے۔ یہی اس اُمت کا مقصدِ زندگی ہے۔ یہی اس کی روح اور جان ہے۔ اسی سے اس کے اندر طاقت اور قوت پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر آج مسلمان اپنی قوت کے اس خزانے کو پہچان لیں تو وہ دُنیا کے اندر ایک بار پھر غالب آ جائیں گے، اور اگر اس کو نہیں پہنچانیں گے تو ان کی تعداد خواہ اربوں بھی ہوجائے، ان کے پاس اربوں کھربوں ڈالر اور پٹرول کی دولت بھی آ جائے، ان کی لاکھوں کی فوجیں بھی ہو جائیں، مگر وہ دُنیا کے اندر کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

میرے عزیزو، میرے بچو! دراصل یہ وہ بنیادی بات ہے جو مسلمانوں کو خود بھی سمجھنا چاہیے اور دوسروں کو بھی سمجھانا چاہیے کہ یہ مسلمان کا اصل مقصد وجود ہے۔ اسی کے لیے اس کو اپنی جان اور مال لگانا چاہیے، اور جان اور مال لگانے کا نام ہی جہاد ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❖❖❖